سلسلے میں عدل وانصاف کی ایسی مثال قائم کی کہ دنیا کی کوئی دوسری قوم ان کا جواب پیش نہیں کر سکتی۔ خلفائے راشدین کو اپنی اس ذمہ داری کا جو احساس تھا، اس کا اندازہ حضرت عمر فاروقؓ کے اس وصیت سے کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے اپنے بعد آنے والے خلیفہ کے لیے قلم بند کرائی تھی۔ فرمایا:

اوصیہ بذمۃ اللہ وذمۃ	یعنی میں وصیت کرتا ہوں کہ جن لوگوں سے
رسولہ ان یوفی لھم بعھدھم	اللہ اور رسول کا عہد ہے اسے پورا کیا
وان یقاتل من ورائھم وان	جائے خواہ ان کی خاطر تلوار ہی کیوں نہ اٹھانی
یکلفوا فوق طاقتھم	پڑے اور یہ کہ ان سے ان کی طاقت سے زیادہ
	کام نہ لیا جائے

انسانی جان کی حرمت کے علاوہ اس دور میں عالمی امن کے لیے جس بات پر زور دیا جا رہا ہے وہ ہے پُرامن بقائے باہمی۔ لیکن کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں ؟ کہ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے دوسرے مذاہب کو پرامن بقائے باہمی کی دعوت دی تھی۔

قرآن مجید نے مسلمانوں پر لازم ٹھہرایا ہے کہ وہ تمام انبیاء کرام پر ایمان لائیں، ان کا احترام کریں اس نے صاف صاف اعلان کیا کہ ان میں سے ایک کا انکار گویا سب کا انکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت بھی جب اہل کتاب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانی دشمن تھے اور انھوں نے آپ کی دشمنی اور بے حرمتی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا، مسلمان حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کا نام آنے پر عقیدت سے اپنا سر جھکا دیتے تھے اور اس دور ہی کی بات نہیں اس عہد زوال میں بھی مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ عیسائی اور یہودی اقوام کے ظلم وستم کے باوجود ان کی طرف مبعوث ہونے والے پیغمبروں کے نام کے ساتھ "علیہ السلام" کا اضافہ کیے بغیر نہیں رہتے۔

دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ اسلام پرامن بقائے باہمی کا جو رشتہ استوار کرنا چاہتا تھا اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اس نے اہل کتاب کو خود آگے بڑھ کر یہ دعوت دی کہ:

یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ	اے اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف جو
سواء بیننا وبینکم	ہمارے اور تمہارے درمیان قدر مشترک

کی حیثیت رکھتی ہے۔

آج کہا جاتا ہے کہ ہر شخص کو عقیدہ و مذہب کی آزادی ہونی چاہیے مگر یہ قرآن حکیم ہی تو ہے جس نے چودہ سو سال پیشتر اس بات کا اعلان کر دیا تھا:

لا اکراہ فی الدین — دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں۔

یہ اسی تصور کا نتیجہ تھا کہ اس نے دوسرے مذاہب کو ان کے مذہبی معاملات میں جملہ تحفظات عطا کیے اور اس مسجدِ مقدس میں بھی قرآن لانے والے "رسول السلام" نے انہیں اپنے مذہبی رسوم ادا کرنے کی اجازت دے دی جو بیت اللہ شریف کے بعد مسلمانوں کا دوسرا حرم ہے۔

تاریخ میں آتا ہے کہ نجران سے عیسائیوں کا وفد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو زاد المعاد میں ہے کہ خود آپ کی اجازت سے ان لوگوں نے مسجد نبوی میں اپنی نماز ادا کی۔ یہ تو پھر اہل کتاب تھے، وہ لوگ بھی جو بت پرست اور مشرک تھے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اسی رواداری اور فراخدلی سے سرفراز ہوئے۔

زرقانی جلد ۴ ص پر ہے کہ جب طائف سے بنو ثقیف کا وفد آیا تو آپ نے اسے مسجدِ نبوی میں ٹھہرایا۔

لما قدموا علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرب علیھم قبۃ فی ناحیۃ المسجد — جب یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مسجد نبوی کے ایک گوشہ میں ان کے لیے ایک خیمہ نصب کیا گیا۔

بعض روایات میں ہے کہ کچھ صحابہ کو اس سے غلجان بھی ہوا اور انھوں نے کہا بھی کہ یہ تو نجس لوگ ہیں۔ اس پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

لیس علی الارض من نجاستھم شیء — ان لوگوں کی ناپاکی کا زمین سے کوئی تعلق نہیں۔

بت پرست مشرکین آپ کی شان میں کیا کیا گستاخیاں روا نہیں رکھتے تھے مگر قرآن حکیم نے ان کے بتوں اور دیوی دیوتاؤں کو برا کہنے سے منع کر دیا۔ فرمایا:

لا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم

اور تم ان کو برا مت کہو جن کی یہ مشرک خدا کے سوا عبادت کرتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مشرک علم نہ ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو برا بھلا کہنے لگیں۔

قرآن حکیم نے دین میں جبر کی ممانعت کی تو ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ مذہب کے معاملے میں کسی پر سختی روا رکھنا یا عقائد کے باب میں کسی کو برا بھلا کہنا اس لیے بھی عبث ہے کہ ہر شخص اپنے ہی مذہب کو اچھا سمجھتا ہے۔ اس لیے محکم دلائل کے ساتھ حق بات واضح کر دینے کے بعد ہر ایک کا معاملہ اس کے خدا ہی پر چھوڑ دو۔ وہی خود آخرت میں اس سے نمٹ لے گا۔ فرمایا:

کذالک زینا لکل امۃ عملھم ثم الی ربھم مرجعھم فینبئھم بما کانوا یعملون

اسی طرح ہم نے ہر گروہ کے اعمال اس کی نگاہ میں خوشنما بنا دیے پھر ان سب کو اپنے رب کی طرف واپس جانا ہے تو وہ اس وقت ان کو ان کے اعمال کی حقیقت سے آگاہ کر دے گا۔

یہ بھی وضاحت کر دی کہ دین کے معاملہ میں جبر کی اجازت ہوتی تو اللہ تعالیٰ انسان کو مختار ہی کیوں بناتا۔ وہ خود نہ اسے مجبور بنا کر مومن و مسلم کر لیتا۔ فرمایا:

ولو شاء ربک لآمن من فی الارض کلھم جمیعا افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین

اگر آپ کا رب چاہتا تو جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کے سب ایمان لے آتے۔ تو پھر کیا تم لوگوں کو اس بات پر مجبور کرو گے کہ وہ ایمان لے آئیں۔

فرمایا تمہارا کام یہ ہے کہ تم اسلام کی تبلیغ کرتے رہو۔ ایمان لانا یا نہ لانا ہر ایک کا ذاتی معاملہ ہے:

فذکر انما انت مذکر لست علیھم بمصیطر

آپ تو بس نصیحت کر دیا کیجئے کیونکہ آپ صرف نصیحت کرنے والے ہیں

آپ ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے۔

اور یہی حق اس نے دوسرے مذاہب کا بھی تسلیم کیا ہے کہ ان کے ماننے والے اپنے اپنے دائرے میں اپنے اپنے عقیدہ و عمل کے مختار اور ذمہ دار ہیں۔ دلیل اور برہان کے ساتھ اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق ان کو بھی حاصل ہے لیکن دین کے معاملہ میں جبر وہ بھی نہیں کر سکتے۔

سورۃ شوریٰ میں فرمایا:

اللہ ربنا و ربکم ولنا اعمالنا	اللہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی۔
و لکم اعمالکم لا حجۃ بیننا	ہمارے اعمال ہمارے لیے ہیں اور
و بینکم اللہ یجمع بیننا و	تمہارے تمہارے لیے۔ ہماری تمہاری
الیہ المصیر	کچھ بحث نہیں اللہ ہم سب کو جمع کرے
	گا اور اسی کے پاس جانا ہے۔

پر امن بقائے باہمی جس میں ہر شخص کو اپنے مذہب پر چلنے اور اس کی تبلیغ کرنے کی اجازت ہو اور انسانی جان کا احترام۔ یہ دو اصول اسلام کی تعلیماتِ اجتماعی کی اساس ہیں اور یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر عالمی امن کے قیام کا انحصار ہے۔ آج جب کہ ہر چہار طرف انسانیت پر بدامنی کے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں، ضرورت ہے کہ قرآن کی اس روشنی کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور اقوامِ عالم کو دعوت دی جائے کہ وہ ان خطوط پر عمل کر کے انسانیت کو امن اور آشتی سے ہم کنار کریں۔

مولانا شمس الحق صاحب افغانی

اسلام میں رہبانیت نہیں

الحمد للہ رب العلمین و العاقبۃ للمتقین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ الہ واصحابہ اجمعین ۔

دنیا کے جملہ مذاہب میں سے صرف اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ لوگوں کو اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے واضح ہدایات دیتا ہے۔ اسلام کی تقلید کرنے والا ہر زوان گشت اجتماعی اور معاشرتی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے اندر رہبانیت کا وجود بالکل نہیں ہے۔ یعنی کوئی شخص دنیا اور دنیا کے تمام لوگوں سے الگ رہ کر اسلام کی اتباع کرتے ہوئے زندگی نہیں گزار سکتا جس طرح ہندومت بدھ مت اور عیسائیت وغیرہ مذاہب باطلہ میں تعمیر شخصیت کے لیے انقطاع تعلقات پر زور دیا گیا ہے، وہ تزکیہ نفس، نجات روح اور مسرت روحانی کے حصول کے لیے عزلت وگوشہ نشینی اور ریاضت ومجاہدہ کی زندگی کو لازمی قرار دیتے ہیں۔

ان تینوں مذاہب کا تصور کائنات یہ ہے کہ یہ دنیا آلام اور دکھوں کی آماجگاہ ہے، اس کے ساتھ وابستگی برقرار رکھتے ہوئے فوز وفلاح سے ہمکنار ہونے کا تصور نہیں کیا جاسکتا، اگر لوگوں کے ساتھ مل کر زندگی بسر کی جائے، کسی شہر یا گاؤں وغیرہ انسانی آبادی میں مکان بنا کر رہائش اختیار کی جائے تو یہ روح کے لیے تکالیف شاقہ کا باعث اور خداوند تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب کا سبب ہے۔ اس لیے اگر روح کو آسودگی پہنچانا چاہتے ہو تو دنیاوی آرام وعشرت کی زندگی کو خیر باد کہو اور انسانی آبادی سے دور رہ کر کسی مقام پر ریاضت ومجاہدہ کرو اور اس طرح ایام زندگی گزار کر اس دنیائے فانی سے رخصت ہو جاؤ۔

مذاہب باطلہ کا یہی تصور نجات و تصور حیات ہے جسے اسلام رہبانیت سے تعبیر کرتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو اس قسم کی زندگی گزارنے سے سختی کے ساتھ باز رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ حدیث نبوی ہے:۔

لا رھبانیۃ فی الاسلام — اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔

وہ کہتا ہے کہ رہبانیت کی ابتداء نصاریٰ نے کی تھی اور وہ اس کے ذریعے رضاءِ خداوندی حاصل کرنا چاہتے تھے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

ورھبانیۃ ن ابتدعوھا ما کتبناھا علیھم الا ابتغاء رضوان اللہ فما رعوھا حق رعایتھا	اور انہوں نے رہبانیت کو خود ایجاد کر لیا، ہم نے ان پر اس کو واجب نہ کیا تھا لیکن انھوں نے حق تعالیٰ کی رضا کے واسطے اس کو اختیار کیا تھا سو انھوں نے اس رہبانیت کی پوری رعایت نہ کی۔

(بیان القرآن)

اگر ہم قرآن و سنت کے وسیع ذخیرے پر مجموعی حیثیت سے نظر ڈالیں تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ان کے عام اور بیشتر احکام و تعلیمات کی بنیاد سوسائٹی اور معاشرہ کے وجود پر ہے۔ اگر کوئی معاشرہ موجود نہ ہو تو ان احکام کی تعمیل و تکمیل غیر متصور ہے۔

مثال کے طور پر نماز کو لیجیے۔ قرآن کریم میں اقامتِ صلوٰۃ کے متعلق متعدد آیات مذکور ہیں اور حدیث نے قولی و عملی ہر دو طریقہ سے ان کی تشریح و توضیح کر دی ہے۔ نماز کی اقامت کے لیے اسلام مساجد کے قیام کا حکم دیتا ہے۔ پھر نماز کے وقت وہاں پر تمام مسلمانوں کو جمع کر کے انھیں منظم طریقہ سے صفوں میں کھڑا کیا جاتا ہے اور پھر انھیں ایک امام کی اطاعت میں نماز کے ارکان بجالانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ ان تمام امور میں اجتماعیت اور نظم و ضبط پایا جاتا ہے اور عزلت و انفرادیت کی حالت میں اسلام کے یہ جملہ احکام ناقابلِ عمل ہو جاتے ہیں۔

یہی حال حج کا بھی ہے کہ اس میں شہری یا ملکی سطح پر نہیں بلکہ عالمی سطح پر تمام مسلمانانِ عالم کو جمع کیا جاتا ہے اور انھیں اتحاد و یگانگت کا تصور تازہ کرایا جاتا ہے۔

بعینہ یہی حال جہاد کا بھی ہے کہ اس میں اجتماعیت اور یک جہتی کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا
یہ چند احکام بطورِ مثال اس بات کے ثابت کرنے کے لیے ذکر کیے گئے ہیں کہ اسلامی تعلیمات و احکام کی روح اور ان کا مزاج رہبانیت کے سراسر مخالف ہے۔

تعمیرِ شخصیت

تعمیرِ شخصیت اور تہذیبِ نفس کی اچھائی اور عمدگی میں کسی عقلمند انسان کو کلام ہو سکتا ہے؟ اسلام بھی یہی چاہتا ہے کہ تمام انسان با اخلاق، مہذب اور ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھنے والے ہوں، ان کے نفوس پاک اور ان کی طبائع کج روی سے دور ہوں لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے وہ رہبانیت اور انقطاعِ تعلقات کو ذریعہ کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ یہ چیز اصل مقصد کے فوات کا سبب بن جاتی ہے۔ اس سے خلقتِ انسانی سے متعلقہ وہ مقاصد پورے نہیں ہوتے جن کے لیے اللہ نے اسے اس کائناتِ ارضی میں بھیجا ہے اور خلافت و نیابتِ الٰہی کی ذمہ داریوں سے وہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اسلام نے اپنے اندر سرے سے رہبانیت کی گنجائش ہی نہیں رکھی اور انسان کو اجتماعی و معاشرتی زندگی گزارنے کے لیے مجبور کر دیا۔

اسلام چاہتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ انسان خود کامل، مہذب اور اخلاقِ جمیلہ اور صفاتِ حمیدہ سے آراستہ و پیراستہ ہو بلکہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی راہِ راست پر لائے، ان کو اچھے کاموں کی تلقین کرے اور بُرے کاموں سے منع کرے، معاشرہ کو غلط کاریوں سے بچا کر صحیح راہ پر گامزن کرے۔

قرآن و حدیث میں معاشرہ سے متعلق دیے گئے احکام کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلے گا کہ وہ ہم میں سے ہر فرد کو معاشرتی برائیوں کے سدّباب کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ وہ ہمیں حکم دیتا ہے کہ تم عدل قائم کرو اور خلقِ خداوندی کے ساتھ احسان کرو۔ چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ — اللہ تعالیٰ عدل و احسان اور قرابت والوں کو دینے کا حکم فرماتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جب کوئی معاشرہ اور جمعیت انسانی موجود نہ ہوگی تو یہ احکام بھی مہمل اور بے سود ہوں گے اور خداوند قدوس کی ذات پاک اس سے بلند و بالا ہے کہ اس کے احکام اغراض و مقاصد سے خالی

علاوہ ازیں حکومت و سلطنت کو قرآن مجید اہل ایمان و تکلو ہی افراد کی نیکیوں اور اعمال حسنہ کا ثمرہ و نتیجہ قرار دیتا ہے۔ چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے :

وعد اللہ الذین امنوا منکم	اللہ کا وعدہ ہے کہ تم میں سے جو ایمان لائیں
وعملوا الصٰلحت لیستخلفنھم	اور اچھے کام کریں انھیں زمین میں خلافت
فی الارض کما استخلف الذین	عطا کرے گا جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں کو دی
من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم	تھی اور ان کے لیے اپنا پسندیدہ دین مستحکم
الذی ارتضٰی لھم	کر دے گا۔

آیت مذکورہ بالا سے پتہ چلتا ہے کہ خلافت فی الارض کا حق ان لوگوں کا ہے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے۔ معلوم ہوا کہ خدا کی رضا اور اس کے ہاں انسان کی فلاح اس سے وابستہ نہیں ہے کہ وہ کس قدر خلوتوں اور تنہائیوں میں رہ کر ریاضت و مجاہدہ کرتا ہے بلکہ اس کا دار و مدار کائنات ارضی پر دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر ایسی زندگی گزارنے میں ہے، جس میں ایمان باللہ اور اعمالِ صالحہ پر عمل پایا جاتا ہو

اسی آیت سے قریب المفہوم ایک دوسری آیت یہ بھی ہے :

الذین ان مکنھم فی الارض	ایسے لوگ جنھیں ہم زمین میں اقتدار
اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ	بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں
وامروا بالمعروف ونھوا	گے، نیکیوں کا حکم کریں گے اور برائیوں سے
عن المنکر	روکیں گے۔

قرآنی آیات کے علاوہ ہمیں زندگی کے لیے جو احکام ملتے ہیں، ان کی تکمیل بھی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ باقاعدہ ایک معاشرہ موجود نہ ہو۔

حضور کے ایک صحابی مجرد رہنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے بغیر اس کے چارہ کار نہ تھا کہ وہ خصی ہوں۔ چنانچہ آپ نے سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی اجازت طلب کی لیکن آپؐ نے انھیں ایسا کرنے سے روک دیا۔

حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

عن سعد بن ابی وقاص قال رد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی عثمان بن مظعون التبتل ولو اذن له لاختصینا

سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان بن مظعون کا تبتل (دنیا سے مکمل انقطاع) کا ارادہ رد فرما دیا اگر انہیں اجازت مل جاتی تو ہم بھی خصی ہو جاتے۔

معاشرتی حقوق

معاشرتی حقوق و فرائض کی تفصیل ایک حدیث میں وارد ہوئی ہے چنانچہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

عن عبد اللہ بن عمر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته فالامام الذی علی الناس راع وهو مسئول عن رعیته والرجل راع علی اهل بیته وهو مسئول عن رعیته والمرأة راعیة علی بیت زوجها وولده وهی مسئولة عنهم وعبد الرجل راع علی مال سیده وهو مسئول عنه الا فکلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته (مشکوٰۃ کتاب الامارۃ ص ۳۲۱)

عبد اللہ بن عمرؓ کہتے ہیں رسول خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا بیشک تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ۔ بادشاہ اپنے تمام لوگوں کا ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی ساری رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔ ایک شاہل آدمی اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے اور انھیں کے بارے میں مسئول۔ ایک شادی شدہ عورت اپنے شوہر کے گھر کی اور اس کی اولاد کی ذمہ دار ہے اور ان کے بارہ میں اس سے سوال ہوگا۔ یہاں تک کہ ایک غلام بھی اپنے آقا کے مال کا ذمہ دار ہے اور اس کے بارے میں جواب دہ غرضیکہ خوب سمجھ لو تم میں سے ہر ایک